ایم۔ ڈبلیو۔ گذدر

اجتہاد کی اہمیت

ڈاکٹر محمصانی نے اجتہاد کے لغوی معنی "امکانی کوشش صرف کرنے کے لیے ہیں جو دلائل شرعیہ کے ذریعے استنباط احکام کے لیے کی جائے" چونکہ شرع اسلامی شریعت الٰہیہ ہے جو مشہور اور مقرر اصول سے ماخذ ہے۔ خواہ وہ اصول منقول ہوں، جیسے کتاب اللہ، سنت نبوی یا عقلی ہوں، جیسے اجماع، قیاس، اور استحسان وغیرہ۔ پس انہی دلائل شرعیہ سے استخراج احکام کا نام اجتہاد ہے، اور اجتہاد ہی کے ذریعے معاملات روزمرہ اور معاشرۂ انسانی کے تقاضوں کو کما حقہٗ پورا کیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اجتہاد شرع اسلامی کی تاریخ کا لازمی عنصر شمار ہوتا ہے۔ قرآن و سنت میں کسی مسئلہ کا حکم نہ پانے پر اجتہاد سے کام لیتے ہیں۔ (فلسفۂ شریعت ص ۱۴۷)۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اجتہاد کی تعریف یوں کی ہے "خوب محنت کرنا، اور دریافت کرنے میں شریعت کے احکام فرع کو، ان کی تفصیل دلیلوں سے جن کی کلیات کا مآل چار قسم پر ہے، یعنی کتاب اللہ، سنت نبوی، اجماع اور قیاس پر (عقد الجید ص ۶)۔

شیعہ امامیہ اثنا عشریہ کی اپنے طریقہ اور طرز اجتہاد کی مستقل فقہ ہے جمہور فقہا جن میں زیدیہ بھی شامل ہیں، ان نصوص کا اعتبار کرتے ہیں، جو نبی صلعم کی وفات تک کی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اب اجتہاد کی بنا قرآن اور سنت نبویہ ہیں جنھیں وہ "وصایا" کا نام دیتے ہیں، قابل اتباع سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے، حضور صلعم کی موجودگی میں کوئی اجتہاد کا مجاز نہ تھا۔ اسی طرح امام کی موجودگی میں کسی کو اجتہاد کرنے کا حق حاصل نہیں۔ تیسری صدی ہجری میں تمام امام وفات پا گئے۔ اب یہ لوگ نصوص میں حل نہ ملنے پر اجتہاد کرتے ہیں، جو عقل پر مبنی ہوتا ہے نہ کہ قیاس

پر (فلسفۂ شریعت)۔

موجودہ دور میں امریکہ و انگلستان میں عملی حیثیت سے اجتہاد کو بڑی اہمیت حاصل ہے ان ملکوں کے قوانین ایک جامع قانون کی شکل میں مرتب نہیں ہیں۔ لہٰذا وہاں کی عدالتیں بڑی عدالتوں کے فیصلوں کی پابند ہیں۔ اور بڑی عدالتیں اپنے طریقۂ کار میں اپنے سابقہ فیصلوں کی پابند ہیں۔ اس لیے وہاں نظائر اور مثالیں بہت اہم خیال کی جاتی ہیں اور "عرفِ عام" (Common Law) کی جگہ سمجھی جاتی ہیں۔ جو بلاشبہ عدالتی قوانین کا ایک مستقل اور بیش قیمت مجموعہ ہیں۔ اسی طرح مجلۂ عدلیہ ترکیہ میں دو دفعات اجتہاد کے متعلق موجود تھیں (ا) نص صریح کے ہوتے ہوئے اجتہاد کی گنجائش نہیں ہے (ب) یعنی ایک اجتہادی فیصلہ دوسرے اجتہادی فیصلوں سے منسوخ نہیں ہو سکتا۔ مگر قدیم اہل روما میں علم قانون ایک سربستہ راز تھا جس کی حفظ و بقا کے فرائض سب سے بڑے کاہن کے ساتھ مخصوص تھے۔

اجتہاد ہر شخص کے لیے جائز نہیں بلکہ اجتہاد کرنے کے لیے ان مخصوص صلاحیتوں کا ہونا ضروری ہے جو مجتہد کو اس قابل بنا دے کہ وہ استخراج احکام اور استدلال کے کام کو بخوبی سرانجام دے سکے۔ مثلاً (۱) وہ صاحب الرائے ہو (۲) صاحب فراست ہو (۳) انصاف پسند ہو (۴) پاکیزہ اخلاق کا مالک ہو (۵) احکام سمجھنے کی بصیرت تامہ رکھتا ہو یعنی دلائل شرعیہ اور استنباط احکام کے طریقوں سے پوری طرح واقف ہو۔ اس کے ساتھ زبان پر پورا عبور رکھتا ہو (۶) تفسیر قرآن، اسباب نزول، راویوں کے حالات، جرح و تعدیل کے طریقوں اور ناسخ و منسوخ کی حقیقت سے پوری طرح باخبر ہو۔ مگر علامہ شاطبی نے مزید اس شرط کا بھی اضافہ کیا ہے کہ مجتہد مقاصد شریعت سمجھنے کی مہارتِ تامہ رکھتا ہو۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں "اگر مذکورہ بالا تعریفوں میں سے مجتہد ایک قسم سے بھی ناواقف ہے تو اس کی سبیل دوسرے کی تقلید کرنا ہے۔ اگرچہ وہ شخص ایک مذہب میں کسی کے ائمہ

سلف میں ماہر کامل ہو، تو ایسے شخص کو عہدۂ قضا اختیار کرنا اور فتویٰ دینے کا امیدوار ہونا درست نہیں، اور جس صورت میں کہ ان مذکورہ علوم کا جامع اور خواہشاتِ نفسانی اور بدعتوں سے علیحدہ ہو اور ورع اور تقویٰ کو شعار بنایا ہو، اور کبیرہ گناہوں سے محترز ہو اور صغیرہ پر اصرار نہ رکھتا ہو تو اس کو قاضی ہونا اور اپنے اجتہاد سے شرع میں تصرف کرنا جائز ہے، اور اس شخص پر جو ان شرطوں کا جامع نہیں، تقلید کرنا شخص جامع کی واجب ہے۔ ان حادثوں میں جو کہ اس کو پیش آئیں (بحوالہ عقد الجید ص ۲۲)۔

ڈاکٹر محمصانی نے مجتہدین کے مختلف درجات بتلائے ہیں:

۱۔ مجتہد فی الشرع: جو کسی مذہب کا بانی ہو۔ جیسے امام ابوحنیفہ۔ امام مالک۔ امام شافعی۔ امام احمد بن حنبل۔

۲۔ مجتہد فی المذہب: وہ کہلاتا ہے جو کسی مذہب کا بانی نہ ہو، بلکہ ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کا مقلد ہو۔ لیکن کئی ایک فروعی مسائل میں اپنے پیشرو امام سے اختلاف رکھتا ہو۔ اور اپنے ذاتی اجتہاد سے فروعی مسائل کا استخراج کیا ہو۔ جیسے مذہب حنفی میں صاحبین امام ابو یوسف اور امام محمد بن حسن شیبانی اور مذہب شافعی میں امام مزنی وغیرہ۔

۳۔ مجتہد مسائل: جو مذہب کے اصول و مبادی میں نہیں بلکہ بعض فروعی مسائل میں اپنے اجتہاد سے کام لے۔ جیسے مذہب حنفی میں امام طحاوی، امام سرخسی اور مذہب شافعی میں امام غزالی وغیرہ۔

۴۔ مجتہد مقید: جو آراء سلف کا پابند ہو، اور انھیں کے اجتہاد کی پیروی کرتا ہو۔ لیکن احکام کی حقیقت اور ان کے منشا کو اچھی طرح سمجھتا ہو۔ ایسے مجتہدوں کو اصحاب تخریج کہا جاتا ہے (بحوالہ فلسفہ شریعت)۔

بلاشبہ آنحضرت صلعم کے عہد میں اجتہاد بہت کم ہوا۔ وہ بھی اس لیے کہ صحابۂ کرامؓ کو اس کی رغبت دلائی جائے، اور انھیں اس راہ پر چلنے کا عادی بنایا جائے۔ تاکہ پیش آمدہ مسائل میں

جہاں شرعی نصوص ان کی رہنمائی نہ کریں وہ اجتہاد کرلیں۔ آنحضرت صلعم کی وفات پر وحی کا سلسلہ منقطع ہوگیا، اور اجتہاد نبوی کا دروازہ بند ہوگیا، اور اس فریضہ کو کبار صحابہؓ و فقہاء نے انجام دیا۔ مثلاً حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبداللہؓ بن حضرت عمرؓ وغیرہ۔ ان حضرات کے فتاویٰ بعد میں آنے والے لوگوں کے لیے اجتہاد کے باب میں سنگ میل ثابت ہوئے یہ مجتہدین اولین کتاب وسنت کی نص معلوم کرنے کی کوشش کرتے۔ اس میں انھیں کامیابی نہ ہوتی تو اجتہاد فرماتے۔ ان میں اکثر نے قیاس سے بھی اجتہاد کیا، اور وہ یہ ہے کہ ایک غیر منصوص احکام کی علت وغائت معلوم کرنے سے ہی ہو سکتا ہے۔ جب یہ امر کی تحقیق پوری ہو جاتی، اور کوئی خاص علت غیر منصوص معاملے میں بھی موجود ہے تو اس پر بھی وہی حکم لگایا جاتا تھا۔ ان میں سے حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت زید بن ثابتؓ ہیں۔ بعض صحابہ امر غیر منصوص میں مصلحت کو پیش نظر رکھتے ہوئے بھی اجتہاد فرماتے تھے۔ خصوصاً حضرت عمرؓ سلطنت کے ان سیاسی امور میں مصلحت سے فیصلے صادر فرما دیتے تھے جن کے بارے میں نص خاموش ہوتی اور اکثر قضاۃ کو قیاس ہی کے ذریعے فیصلے صادر کرنے کی ترغیب دلاتے تھے، جیسے آپؓ نے حضرت موسیٰ اشعریؓ کو لکھا "معاملات میں مماثلت کو پہچانو اور اس وقت قیاس کرو" (بحوالہ تاریخ فقہ اسلامی، خضری)۔

عہد صحابہ کے بعد تابعین کا دور آتا ہے۔ ان میں اکثر قیاس سے اجتہاد کرتے تھے اور یہ لوگ ملک عراق میں قیام پذیر تھے۔ مثلاً امام علقمہ۔ امام ابراہیم نخعی۔ امام ابوحنیفہ اور یہ لوگ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی پیروی کرتے تھے، اور اہل مدینہ حضرت عمرؓ کے نقش قدم پر مصلحت سے اجتہاد کرتے تھے۔ مثلاً حضرت سعد بن مسیب نے مصلحت کے پیش نظر فتاویٰ دیے۔ اس مکتب فکر میں امام مالکؒ نمایاں نظر آتے ہیں۔

تابعین کے زمانے کے بعد تکوین مذاہب فقہ کا دور آیا۔ امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے دور تک کوئی چیز مدون نہیں ہوئی تھی کہ امام شافعی کا زمانہ آیا۔ انھوں نے اہل حجاز اور اہل عراق

کی آرا کا موازنہ کرنے کے لیے باقاعدہ قواعد مرتب کیے۔ اب استنباط کے لیے کلی اصول بھی واضح ہونے لگے۔ ان اصول میں ان کا باہمی ایک دوسرے کے ساتھ کبھی کبھی اتفاق اور اختلاف ہوتا رہتا تھا۔ ان پہلی تین صدیوں میں مجتہدین کی کثرت کے تناسب سے اجتہادی مذہب بھی کثرت کے ساتھ نمودار ہوئے۔ کیونکہ ہر مجتہد کا اپنی فقہی آرا اور اپنے ہی اجتہاد سے مرکب و مدوّن الگ الگ مذہب تھا۔ اکثر مذاہب تو اپنے اپنے مجتہد کی وفات کے بعد صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔ داودیہ، ظاہریہ، طبریہ وغیرہ اپنے اپنے مذاہب کے لیے مناظرے کرتے تھے۔ اور طبقہ مخرجین کے بعد طبقہ مرجحین پیدا ہو گیا جو اپنے مذہب ہی کے اقوال میں سے کسی ایک قول کی دلیل یا ائمہ کی کسی روایت کو مضبوط پاکر اپنے عمل کے لیے منتخب کر لیتے تھے۔ ان کے طبقہ مقلدین کا دور آتا ہے۔ جو مطلقاً مقلد تھے۔ ان میں نہ تو تخریج کی صلاحیت تھی اور نہ ترجیح کی۔ بلکہ مکھی پر مکھی مارتے رہے اور یہ چھٹی ہجری اور ساتویں ہجری اور اس کے بعد کا زمانہ ہے۔

اس مختصر تاریخی جائزہ سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اجتہاد شریعت کے لیے روح اور اس کی فقہ کے لیے سرچشمہ حیات ہے۔ یہی سیاسی جمود کا نتیجہ تھا کہ امام ابن قیمؒ بر ملا اُٹھے۔ اور اپنی مشہور تصنیف 'اعلام الموقعین' میں نہایت نفیس بحث کی ہے۔ اس میں مختلف مذاہب کے مقلدین کا رَد کیا ہے اور ان کے اس طرز عمل کی مذمت کی ہے کہ وہ اپنے جمود پر قائم رہنے کی وجہ سے شریعت کے سدا بہار چشموں کو خشک کرنے کا باعث بنے، اور امراء و سلاطین کو موقع دیا کہ وہ ضروریات کی تکمیل و تنظیم کے لیے اپنی مرضی کے قوانین جاری کریں۔ کیونکہ اب فقہی احکام میں ان کے لیے رہنمائی باقی نہیں رہی۔ حالانکہ یہ تنگی شریعت میں نہیں بلکہ ان مذاہب کے تنگ ظرف مقلدین کی عقلوں میں ہے۔

ان تصریحات میں غور کرنے کے بعد ایک عاقل کے لیے یہ باور کرنا کچھ مشکل نہیں کہ اجتہاد کا دروازہ بند کر دینا شریعت مطہرہ اور اس جلیل القدر فقہ کے لیے کتنی بڑی مصیبت کا پیش خیمہ

ثابت ہوا۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنی مشہور کتاب 'حجۃ اللہ البالغہ' میں لکھتے ہیں" چوتھی صدی کے بعد سے کچھ تو علما کے اختلافات اور بحث مناظرہ کی وجہ سے، کچھ ان کے ذہنی و اخلاقی معیار کے پست ہو جانے کی وجہ سے، کچھ علمی انحطاط اور پست ہمتی، کم محنتی کی وجہ سے اس تقلید کی ضرورت پیش آئی۔ اور اس میں عافیت و حفاظت سمجھی گئی کہ پیشرو ائمہ و مجتہدین اور مذاہب کی تقلید اختیار کر لی جائے، اور معاصرین کے بجائے متقدمین کے فتویٰ پر عمل کیا جائے۔ لیکن عرصے تک اس میں تعین و التزام اور تقلید شخصی کی وہ پابندی نہیں پیدا ہوئی تھی جو بعد کی صدیوں میں نظر آتی ہے۔ رفتہ رفتہ تقلید شخصی کو اختیار کیا گیا۔ لیکن اس کی حیثیت بھی تشریعی نہیں بلکہ انتظامی تھی۔ انتشار اور اتباع کی ہوا سے بچانے کے لیے نیز عملی سہولت کی بنا پر ایک مذہب کی تقلید عملاً رائج ہو گئی، اور ایسا ہونا ایک قدرتی امر اور واقعات کے عین مطابق تھا۔ خصوصاً تاتاری یورش کے بعد عالم اسلام پر عالمگیر فکری انحطاط اور علمی زوال طاری ہوا، اور ایسی شخصیتوں کا عام فقدان ہوا جو اجتہاد کی صلاحیت رکھتے ہوں، اور فرقوں اور فتنوں کی گرم بازاری ہوئی تو اس میں عافیت سمجھی گئی۔ کہ جن مذاہب کا کتاب اللہ اور سنت نبوی کے مطابق ہونا ثابت ہے، اور جو بحث و مباحثہ کے منازل طے کر چکے ہیں، اور ان کی تدوین مکمل ہو چکی ہے ان پر عمل کیا جائے۔ یہ خصوصیات مذاہب اربعہ میں پورے طور پر پائی جاتی تھیں۔ اس لیے عام طور پر انھیں کو اختیار کیا گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا" وہ مقلد صرف آنحضرت صلعم کے قول کا پابند ہے۔ حلال اس کو سمجھتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ حلال کہیں۔ اور حرام اس کو مانتا ہے جس کو اللہ و رسول حرام فرمائیں۔ لیکن چونکہ آنحضرت صلعم کے قول کا اس کو براہ راست علم نہیں، اور آپؐ سے جو مختلف حدیثیں روایت کی جاتی ہیں، ان میں تطبیق کی اس کو لیاقت نہیں۔ نہ آپؐ کے کلام سے مسئلہ ثابت کرنے کا اس کو ملکہ ہے۔ اس لیے اس نے ایک صاحب رشد عالم کی اس بنا پر پیروی کی ہے کہ وہ ظاہری طور پر صحیح فتویٰ دے رہا ہے۔ اور حضور صلعم کی سنت کا

پیرو ہے اگر اس کے گمان کے خلاف نکلے گا تو وہ اس وقت بغیر کسی بحث و اصرار اس فتویٰ اور مذہب کی پیروی سے ہٹ جائے گا۔ اور حدیث پر عمل کرے گا۔

ظاہر ہے کہ اس طرح کی تقلید پر (جو محض سنت کی پیروی کی ایک عملی شکل ہے) کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا۔ ایسے عامی آدمی کو اجتہاد و استنباط مسائل کا مکلف قرار دینا تکلیف بالذات اور انکار مذاہب ہے۔ اس طرح کی تقلید ہر زمانہ میں رہی ہے۔

لیکن رفتہ رفتہ عوام میں جہالت نے اثر کیا اور کہیں کہیں ائمہ کی حیثیت وسائل کے بجائے مقصود اور ایک طرح سے شارع کی پیدا ہو گئی۔ لوگوں کو ان مذاہب سے بالذات دلچسپی اور ان کی اس درجہ عصبیت پیدا ہو گئی کہ وہ کسی حال میں ان کے ایک شوشہ یا نقطہ سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھے۔ علامہ عزالدین بن عبدالسلام لکھتے ہیں "حیرت انگیز بات یہ ہے کہ بعض فقہاء نے مقلدین کو اپنے امام کی دلیل کے ایسے ضعف کا علم ہو جاتا ہے جس کا کوئی جواب نہیں اور وہ اس کے باوجود اس مسئلہ میں اس کی تقلید کرتے ہیں۔ اور ان کا مذہب چھوڑنا گوارا نہیں کرتے۔ بلکہ کتاب و سنت کے ظاہر مطلب کو مانع کرنے کے لیے وہ ہزار تدبیریں کرتے ہیں، اور اپنے امام کی مدافعت میں ہر طرح کے بے بنیاد تاویلوں سے ان کو احتراز نہیں ہوتا" (بحوالہ حجۃ اللہ البالغہ)۔

اسی طرح سے عوام کی ایک جماعت تھی جو اپنے امام کو معصوم عن الخطا سمجھتی تھی۔ اور جس کے قلب میں یہ بات راسخ ہو چکی تھی کہ اس کو امام کی تقلید کسی حال میں نہیں چھوڑنا ہے۔ جاہل مقلدوں نے بے بنیاد مسائل اختیار کر لیے۔ جن کا فقہ سے کوئی علاقہ نہ تھا، اور بہت سے مستشرقین نے یہ حالت دیکھ کر شرع اسلامی کے بارے میں فیصلہ دے دیا کہ وہ ایک پسماندہ قانون ہے، اور یہ خیال کیا کہ اسلامی قانون جدید تمدن کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ حتیٰ کہ انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں ہر جگہ اصلاحی تحریکات شروع ہو گئیں اور سلف صالح کے مذہب کی نشاۃ ثانیہ کا ظہور ہوا۔ چنانچہ شیخ محمد عبدہٗ جیسے بہت سے

امام تقلید ترک کرنے اور کسی خاص مذہب کی عدم پابندی کی تبلیغ کرنے لگے۔ اور انھوں نے تمام مذاہب اسلامیہ کو ایک مرکز پر لانے کی ہر ممکن تدبیر اختیار کی۔ نیز فیصلہ کیا کہ اصولِ شرع اور ان کی حقیقی روح کی طرف رجوع کیا جائے۔ اور ثقافتی ترقی کے میدان میں انھیں چراغ راہ بنایا جائے۔

تقلید کب جائز ہے؟

تقلید کے معنی بے چون وچرا دوسرے کی پیروی کرنا ہے۔ اس شخص کے لیے جائز ہے جو اجتہاد کرنے سے قاصر ہو۔ جیسے عام جہلا، یا وہ طالب علم جس میں ہنوز اجتہاد کی صلاحیت پیدا نہ ہوئی ہو۔

عوام کے لیے تقلید کا جائز ہونا ایک معقول بات ہے۔ کیونکہ اجتماعی اور اقتصادی زندگی کا تقاضا یہی ہے۔ بعض لوگ صنعت وحرفت کا کام کرتے ہیں۔ پس اجتہاد کے مواقع اس شخص کو حاصل نہیں جو علم فقہ میں مہارت تامہ رکھتا ہو۔ مگر جس کو یہ مہارت حاصل نہ ہو اس پر ائمہ ومجتہدین کی تقلید واجب ہے۔ آیۃ

فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم تعلمون ○

یعنی اگر تم علم نہیں رکھتے ہو تو اہل علم سے پوچھو

تقلید کے بارے میں بعض سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً کیا اہل سنت کے نزدیک چار مذاہب کے علاوہ کسی اور مسلک کی تقلید جائز ہے؟ کیا یہ بھی جائز ہے کہ ایک امام کا مسلک ترک کر کے دوسرے امام کا مسلک اختیار کیا جائے۔ ابن صلاح نے پہلے سوال کا جواب دیا ہے کہ "مقلد پر ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کی تقلید واجب ہے، اور کسی کی نہیں۔ اس لیے کہ ان کے مذاہب تمام دنیا میں پھیل چکے ہیں، اور ان مذاہب کے تمام مسائل بحث وتمحیص کے بعد منضبط ہو چکے ہیں، اور ان کی فروعات شائع وذائع ہو چکی ہیں۔ یہ جواب اس لیے معقول ہے کہ مقلد تفصیلی حالات سے ناواقف ہے۔ اس لیے حزم واحتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ

وہ انھی چار مذاہب مشہور میں سے کسی ایک کی تقلید اختیار کرے۔ البتہ دوسرے سوال کے جواب میں رائے مختار ہے کہ اگر کوئی عامی کسی مسئلہ میں کسی ایک مذہب کا اتباع کرے تو وہ دوسرے مسئلہ میں دوسرے مذہب کو اختیار کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ پہلے مسئلہ سے کوئی تعلق نہ رکھتا ہو۔ اسی طرح اگر کوئی آدمی کسی مسئلے میں کسی مجتہد کے فتویٰ پر عمل کرے تو اس کے لیے جائز ہے کہ دوسرے مسئلہ میں کسی دوسرے مفتی کے فتویٰ پر عمل کرے۔ البتہ جب وہ کسی فتویٰ پر عمل کرے تو پھر اس کے لیے دوسرے مذاہب کے فتاویٰ پر عمل کرنا جائز نہیں (الاحکام الامدی)۔

تقلید روح قرآن اور ائمہ کے اقوال کے قطعی خلاف ہے۔ امام ابن قیمؒ نے امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے فرمایا: "کسی کو جائز نہیں کہ ہمارے قول کی پیروی کرے۔ جب تک وہ یہ نہ جان لے کہ ہم نے یہ بات کس بنا پر کہی۔ معن بن عیسیٰ سے روایت ہے کہ انھوں نے امام مالکؒ کو یہ کہتے سنا ہے" یعنی بے شک میں انسان ہوں اور غلطی بھی کر سکتا ہوں۔ اور صحیح فیصلہ میں بھی میری رائے پر غور کیا کرو۔ پس جو رائے کتاب وسنت کے مطابق ہو، اسے اختیار کرو۔ اور خلاف کتاب وسنت ہو۔ ترک کر دو۔ یہی وجہ ہے کہ امام مالکؒ نے خلیفہ ہارون الرشید کو اس بات سے منع فرمایا۔ کہ وہ لوگوں کو مالکی مذہب اختیار کرنے کی ترغیب نہ دیں۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں" یعنی نہ میری تقلید کرو نہ مالک وشافعی کی۔ بلکہ انھی ماخذوں کو پیش نظر رکھو جو ان کے پیش نظر تھے۔ یعنی قرآن شریف وسنت نبوی صلعم۔

اجتہاد کے واجب ہونے اور تقلید کے ممنوع ہونے سے یہ بات بھی لازم آتی ہے کہ جب کسی مجتہد یا قاضی کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس نے اپنے سابقہ فیصلہ میں غلطی کی ہے تو اسے اپنے غلط فیصلہ کی پابندی لازم نہیں۔

امام ابو یوسفؒ پہلے قرآن وحدیث کو لیتے تھے اجتہاد کرنے میں۔ اس کے بعد اماموں خصوصاً امام ابوحنیفہؒ کا حوالہ دیتے تھے، اور کبھی کبھی اپنی رائے بھی دیتے تھے۔ اور کہیں کہیں

امام ابوحنیفہؒ کو دوسرے اماموں کی رائے سے کمتر بتاتے ہیں۔ ائمہ معصوم نہیں ہیں۔ ازراہ بشریت ان سے ضرور غلطیاں سرزد ہوئی ہوں گی۔ تمام فتاویٰ زمانے اور حالات وقت کے مطابق تھے۔ آج کل جو مسائل ہوائی جہاز اور دیگر نئی سائنسی معلومات کے متعلق پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے بارے میں تمام ائمہ کی فقہ خاموش ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام دین فطرت ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے لچک و عمومیت دی ہے جو ہر حالت اور ہر دور میں انسانیت کے پیش آمدہ مسائل کی کفیل و ضامن ہے۔ یہ بات بھی آج صحیح نہیں معلوم ہوتی ہے جیسے امام ابوحنیفہؒ نے لڑکی کی بلوغت کی عمر چودہ سال بتلائی ہے۔ اگرچہ گرم علاقوں میں لڑکیاں چودہ سال کے عرصے میں سن بلوغت کو پہنچتی ہیں۔ برخلاف اس کے ٹھنڈے علاقوں میں لڑکیاں سن بلوغت کو چودہ سال کے بعد کے عرصے میں پہنچتی ہیں۔ اور اس کا دراصل دارو مدار خاندان کی خوش حالی پر موقوف ہے۔ اسی طرح امریکہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ بہت بعد میں دریافت ہوئے اور وہاں کی ضروریات زندگی اور ماحول عرب و عجم سے مختلف ہے اور آج ائمہ کے فتاویٰ وہاں کے لوگوں کی ضروریاتِ زندگی پر پورے نہیں اترتے۔ اسی طرح تین طلاق ایک بار کہنے کا مسئلہ بھی قرآن و حدیث کے قطعی خلاف نظر آتا ہے۔ لیکن مقلد ہمیشہ اپنے امام کی رائے سمجھ کر قبول کرتا ہے۔ حالانکہ حضرت عبداللہ بن حضرت عمرؓ نے اپنی بیوی کو معروف کے مطابق طلاق دی تھی۔ مگر جب آنحضرت صلعم کو معلوم ہوا تو آپؐ نے منع فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی شخص بمع نبی صلعم کے احکام شرعی میں رد و بدل کرنے کا مجاز نہیں۔ امام غزالی فرماتے ہیں کہ "ہمیں چار و ناچار تقلید کرنی پڑتی ہے۔ تاکہ مسلمانوں میں مرکزیت باقی رہے۔"

پس اگر ہم شریعت اور فقہ اسلامی کی روح "اجتہاد" واپس لانا چاہتے ہیں۔ اور اس کا قوم میں جاری و ساری کرنا واجب سمجھتے ہیں تاکہ وہ زمانہ کی بہت سی مشکلات کے لیے ایسے شرعی حل پیش کر سکے جن میں خیال کی گہرائی، اور دلیل کی پختگی ہو، جو ہر قسم کے شکوک و شبہات

سے دور ہوں۔ اپنے اندر بیک وقت تقلید پر جامد اور حق کا انکار کرنے والی بیمار عقلوں کی سرکوبی کرنے کی پوری پوری صلاحیت رکھتے ہوں تو اس کا واحد ذریعہ فقط یہ ہے کہ ہم اجتہاد کی نئے سرے سے نئے اسلوب پر تشکیل کریں۔ اور اسے افراد کے ہاتھ سے نکال کر جماعت کے ہاتھ میں دے دیں۔ اس طرح ہم اسے خلافت راشدہ کے دور کے عملی طریقے پر لا سکتے ہیں۔

۱۔ عالم اسلام کے ممتاز علما جو شرعی علوم میں رسوخ و وثوق کے ساتھ دور حاضر کی نئی روشنی سے بہرہ ور ہوں، سیرت و کردار اور اصلاح و تقویٰ کے لحاظ سے بہت اونچا مقام رکھتے ہوں اور مسلمان ماہرین کی خدمات بھی حاصل کی جائیں، جو جدید علوم و فنون مثلاً قانون، طب، اجتماع اور اقتصادیات وغیرہ میں کامل دسترس رکھتے ہوں جن کا ایماندار ہونا ضروری ہے۔ جن سے فقہاء متعلقہ احکام میں ان کے فنی اور قیمتی مشوروں سے استفادہ کر سکیں۔ ان کو گراں قدر مشاہرے دیے جائیں۔ اور وسیع کتب خانہ مہیا کیا جائے۔ دوسرا انسائیکلو پیڈیا کی طرح اپنے ایک علیحدہ دائرۃ المعارف کی تصنیف بھی لازم ہے۔

مذکورہ بالا اسکیم کو پورا کرنے کی دو صورتیں ہیں۔ اول عالم اسلام میں چندہ کیا جائے۔ مگر عوام میں اس کی اہمیت کا شعور نہیں۔ لہٰذا دوم ایک یا متعدد اسلامی حکومتیں اس اسکیم کو اپنے ہاتھ میں لے لیں اور اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اپنے بجٹ میں کافی اور وسیع رقم مخصوص رکھیں۔